© rasailojaraid.com

قوم، صالح علیہ السلام اور ان کی قوم، لوط علیہ السلام اور اُن کی قوم، شعیب علیہ السلام اور اُن کی قوم
معرکۂ نمرود و خلیل علیہ السلام۔ معرکۂ فرعون و کلیم علیہ السلام۔

اور اگر دولت و اقتدار کو خسارے سے بچاؤ سمجھا جائے تو نمرود و فرعون کا اقتدار، قارون و ہامان کی دولت اور قریش کی سرداری بھی ملاحظہ فرمائیں۔

باقی جو تفسیر پروفیسر صاحب نے پیش فرمائی ہے کہ "والعصر ان الانسان لفی خسر" اور "الا الذین آمنوا" الخ بالکل بے جوڑ ہیں ـــ اس سے قرآن کی ادبی حیثیت مجروح ہوتی ہے۔ اور قرآن کریم وہ کتاب ہے جس نے دنیا بھر کے مخالفوں کو ادب کی بنا پر چیلنج دیا ہے۔

---

(۲)

سورہ "العصر" کے سلسلے میں آخری گذارش

جناب آسی ضیائی صاحب

مئی کے ترجمان القرآن میں سورۃ العصر پر میری گذارشات کے جواب میں اگلے ہی ماہ دو فاضل حضرات نے جو کچھ فرمایا، اس پر میں ان کا ممنون ہوں۔ میں نے اُن کا بغور مطالعہ کیا اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس سے میرے موقف میں کسی قدر تبدیلی آئی ہے۔ مگر اس تبدیلی نے میرے نقطۂ نظر کو اور بھی مستحکم کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی عرض کر دوں کہ سابق مضمون میں بھی میں نے اہلِ علم سے ایک طالب علمانہ استفسار کیا تھا۔ اور اب بھی اس سے زیادہ میرا کوئی مقصد نہیں، البتہ اگر میری موجودہ معروضات کے جواب میں کچھ لکھا گیا اور اس سے میری تشفی نہ ہو سکی تب بھی میں اس موضوع کو مزید طول نہیں دوں گا۔ کیونکہ مناظرہ بازی میرے ذوق کے بھی خلاف ہے اور خود "ترجمان القرآن" کے بھی شایاں نہیں۔

میرا موجودہ تبدیل شدہ موقف یہ ہے کہ زمانہ جس بڑے خسارے پر گواہ ہے وہ موت نہیں، خود گزرتا ہوا زمانہ ہے، جو ہر آن مستقبل سے حال میں آتا ہوا ماضی بن رہا ہے، اور جو ایک بار نکل جائے تو ہرگز ہاتھ نہیں آتا، اور جس کے بھرپور استعمال کے باوجود، اس کے گزر جانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے بعد ہر شخص کو اس سے خاطر خواہ فائدہ نہ اُٹھا سکنے کا قلق رہتا ہے۔ یہ ایک ایسی نفسیاتی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ایک دُنیادار عیاش، ایک کامیاب کاروباری، ایک مقبول شاعر، ایک عظیم فاتح، غرض ہر شخص اپنے گزرے ہوئے زمانہ کو حسرت ہی کے ساتھ یاد کرتا ہے، اور اس کے "ضائع جانے" پر کفِ افسوس ملتا ہے۔ حالانکہ ہے کہ اگر ایک شخص کی ساری زندگی عبادتِ الٰہی میں گزری ہو، وہ بھی گزرے ہوئے زمانہ کے "خسارے" کا غم دل میں رکھتا ہے۔ اس نفسیاتی نکتے کو غالب نے بڑی خوبصورتی سے یوں کہا ہے ؎

ملتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز، صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

یہی انسان کا وہ خسارہ ہے جس پر العصر گواہ ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ گواہی آپ سے آپ اس استثناء سے باہر ہی باہر رہتی ہے، کیونکہ العصر کے خسارے کا احساس تو جیسا اُوپر عرض کیا گیا ہے، اہلِ ایمان کو بھی رہتا ہے، اور اس سے جلیل القدر صحابہؓ تک مستثنیٰ نہیں ہیں۔ ہر بزرگ اپنے آخیر وقت میں یہی کہتا اور پچھتاتا سُنا گیا ہے کہ اُس نے آخرت کے لیے کچھ نہیں کیا۔[1] (مثالیں دینے کی ضرورت نہیں) بلکہ میرے خیال میں تو جو جتنا بڑے درجے کا ایمان و عمل صالح وغیرہ کا سرمایہ رکھتا ہے وہ اتنا ہی ماضی پر متاسف اور مستقبل کی طرف سے فکرمند ہوتا ہے۔ اور یہ ذوقِ ایمان ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر وہ مطمئن ہو کہ اس نے آخرت کے لیے جو کچھ سرمایہ جمع کر لیا ہے وہ کافی ہے تو اُسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ اسی "فوتِ فرصتِ ہستی" کے غم کو غالب نے مزید خوبصورتی کے ساتھ یوں کہا ہے:

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

---

[1] اور اسی کی طرف قرآن نے بھی جابجا اشارہ کیا ہے کہ بامراد اہلِ ایمان وہی ہیں جو "خشیتِ رب" سے کانپتے رہتے ہیں اور اسے "خوف اور طمع" کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس خوف و خشیت کی بنیاد وہی "فوتِ فرصتِ ہستی کا غم" ہی ہو سکتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پس نتیجہ یہ نکلا کہ اگرچہ زمانہ ہر آن انسان کے خسارے میں ہونے کی گواہی دے رہا ہے، مگر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اس خسران کی تلافی آخرت میں کر دی جائے گی، بشرطیکہ وہ ان چار صفات سے آراستہ ہوں (یعنی ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر)

(۲) جناب نورالٰہی کا یہ کہنا کہ "اللہ تعالیٰ کے نزدیک حقیقی خسارہ آخرت کا خسارہ ہے"۔ تو اس سے میں یا کوئی اور انکار کر کے مومن ہی کب رہ سکتا ہے؟ مگر اس حقیقی خسارے کی تلافی پر العصر کس طرح گواہ بن سکتا ہے — یہی میرا اصل سوال ہے۔ آج تک نہ تو زمانے نے یہ دیکھا کہ کافر کی موت پر آسمان سے ندا آئی ہو کہ یہ ابدی خسارے میں جا پڑا!، اور نہ مومن صالح کی موت پر لوگوں نے فرشتے اُترتے اور اس کی روح کو مبارکباد دیتے دیکھے کہ زمانہ اس پر گواہ بن سکے۔ اگر زمانہ اس ابدی خسران و فلاح پر گواہ ہوتا تو وہ کونسا کافر ہے جو ایمان نہ لے آتا؟ یہ سب اُمور انسان سے غیب میں رکھے گئے ہیں۔ اور اس سے اسی ایمان بالغیب کا مطالبہ کیا گیا ہے، جس کا صلہ ابدی فلاح عطا کیے جانے کی ضمانت دی گئی ہے۔

نورالٰہی صاحب نے مولانا فراہی کی تفسیر کا جو حوالہ دیا ہے وہ بھی میرے سوال کا جواب نہیں۔ اُن کا فرمانا ہے کہ پچھلی قوموں نے "اگر نیکیاں کیں بھلائیاں کیں تو خدا نے اُن کو عروج و کمال بخشا۔ اگر انہوں نے ظلم و فساد کی راہ اختیار کی تو قانونِ الٰہی نے انہیں تباہ و برباد کر دیا"۔ مگر مولانا نے سورہ کے استثناء کا سب سے پہلا اور سب سے اہم جزء "ایمان" نظر انداز کر دیا ہے۔ اور ایسا شاید انہوں نے قصداً کیا۔ کیونکہ ایمان نہ لانے والی قوموں نے بھی بعض بنیادی بھلائیاں اختیار کر کے دُنیا میں عروج حاصل کیا ہے۔ اور جب وہ ان بھلائیوں سے تہی دامن ہو گئیں تو تباہی بلکہ فنا کے غار میں جا پڑیں۔ اس معاملے میں مومن و غیر مومن کی کوئی تخصیص نہیں ہے، قدیم بابلی، مصری، چینی، یونانی، رومن، سبائی اور دیگر قومیں، جن کے عروج کی داستانیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ ایمان نہ لانے کے باوجود دُنیا میں خوب پھولیں پھلیں۔ اور قریب کے زمانے میں یورپی اقوام، امریکہ اور روس وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ پھر خود ہی سوچیے کہ زمانہ صرف اہلِ ایمان کو اس خسارے سے محفوظ رہنے کی گواہی کس طرح دے سکتا ہے۔

اسی طرح شاہ عبدالعزیز صاحب کی تفسیر کا اقتباس بھی دعوے کی تردید نہیں کرتا۔ اگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک کافر نے حضرت صدیق اکبرؓ سے یہ کہا کہ تم نے باپ دادا کا دین ترک کر کے لات و عزیٰ کی عبادت چھوڑ کر اور ان دیویوں کی شفاعت سے ناامید ہو کر زیاں کاری کی ہے تو اس کا جواب حضرت صدیقؓ نے وہی دیا جو ایک سچا اور پکا مومن دے سکتا ہے کہ حق کو قبول کرنے والا خائب و خاسر نہیں رہ سکتا۔ یہ پُر اعتماد جواب اللہ کے وعدے پر بھروسہ کر کے انھوں نے دیا، نہ کہ زمانے کو گواہ بنا کر۔ اور اس کی تائید میں اللہ تعالیٰ نے زمانے کی گواہی کے علاوہ اپنا وعدہ پھر دہرا دیا۔

جناب نور الٰہی نے میرے اس دعوے کی بھی تردید کی ہے کہ آخرت میں العصر کا وجود نہیں ہوگا۔ یہ اگرچہ ایک غیر متعلق بحث ہے، مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھی وضاحت کر دی جائے۔ موصوف نے جواب میں ایک فروگذاشت تو یہ کی ہے کہ "العصر" اور "الدہر" کو ہم معنی سمجھ کر سورۂ "دہر" کی پہلی آیت سے استدلال کیا ہے۔ حالانکہ "العصر" کا صحیح مفہوم وہ زمانۂ گزراں ہے کہ جو ماضی، حال اور مستقبل پر منقسم ہوتا ہے، جب کہ "الدہر" اس کیفیت کا نام ہے جسے موجودہ اصطلاح فلسفہ میں "دورانِ خالص" (PURE DURATION) کہا جاتا ہے۔ بہرحال خواہ العصر ہو یا الدہر، دونوں ہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ زمانے کو ازلی ابدی سمجھنا قدیم ملحد یونانیوں کا فلسفہ تھا، جس کی تردید حکماء اسلام نے کی ہے، اور موجودہ صدی میں تو اس کا تصور ہی بدل چکا ہے۔ اب تو "زمان" بھی طول، عرض اور عمق کی طرح "مکان" کی بُعدِ رابع (FOURTH DIMENSION) تسلیم کر لیا گیا ہے۔ یعنی "مکان" کے ساتھ ہی "زمان" بھی قائم ہے۔ اور اگر کوئی مقام ایسا ہے کہ جسے "مقام" کہا جا سکے، "لامکان" بھی ہے جس کا ذکر اسلامی ادبیات میں بارہا آیا، اور آتا رہتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہاں "لازمان" بھی ہوگا۔

اس کے علاوہ زمان کا تصور اضافی بھی ہے اور اس امر کو بھی اب تسلیم کیا جا چکا ہے۔ انسانوں نے اسے اپنی سہولت کے لیے سالوں، مہینوں، گھنٹوں اور منٹوں وغیرہ میں تقسیم کر لیا ہے، ورنہ اس کی لمبائی یا اختصار کا تعلق بڑی حد تک ذہنِ انسانی کی مختلف اور بدلتی ہوئی کیفیات سے ہے۔ بقول اقبال ؎

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بلکہ جوں جوں اقبال کا مطالعہ وسیع و عمیق ہوتا گیا، انہوں نے اس حقیقت کو فلسفیانہ طور پر بھی پیش کیا - اپنی نظم "نوائے وقت" میں زمانے کی زبانی وہ انسان سے کہتے ہیں :

ع در من نگری ہیچم، در خود نگری، جانم

اور ع از جانِ تو پیدایم، در جانِ تو پنہانم

اور "مسجد قرطبہ" میں ارشاد ہوتا ہے۔

تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رَو جس میں نہ دن ہے نہ رات

پھر زیادہ کھل کر لینن کی زبان سے خدا کے حضور عرض کرتے ہیں۔

ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آنات

گویا میں نے اگر آخرت میں "العصر" کا ہونے سے انکار کیا تو یہ میری کوئی اپج نہیں تھی۔

دوسری فروگذاشت جناب نور الٰہی صاحب سے یہ ہوئی کہ زمانے کے وجود کو اس دنیا سے قبل اور مابعد ثابت کرنے کے لیے جن آیات کا حوالہ دیا ہے وہ متشابہات کی قبیل سے ہیں، مگر انہوں نے ان کے لغوی معنی ہی لے لیے ہیں : مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات چھ دن میں بنائی، یا قیامت کا دن انسانی حساب سے پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، وغیرہ۔ حالانکہ ان سے مقصود فقط ذہنِ انسانی کو ذاتِ باری تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کا تصور دلانا اور اس عملِ خداوندی کی اہمیت جتانا ہے۔

ورنہ اگر متشابہات کو بھی اُن کے لغوی معنوں میں لیا جائے تو اللہ تعالیٰ کا "نفس" (تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ ۝) "دو ہاتھ" (بَلْ یَدٰہُ مَبْسُوْطَتٰنِ)، "کئی آنکھیں" (وَاصْنَعِ الْفُلْکَ بِاَعْیُنِنَا) "چہرہ" (کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ) "اس کا بادلوں کے سائے میں آنا" (اَنْ یَّاْتِیَھُمُ اللّٰہُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ) وغیرہ کو بھی لغوی معنوں میں لینا پڑے گا۔ (تَعَالَی اللّٰہُ عَمَّا یَصِفُوْنَ)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲)

اس سلسلے کے دوسرے مضمون میں میرے بزرگ اور محترم رفیق جناب نعیم صدیقی صاحب نے ایک نحوی گرفت کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اِلّا (حرفِ استثنا) سے یہ مطلب نہیں ہوتا کہ پہلے تو بیان کردہ نوع یا گروہ کے تمام کے تمام افراد خسارے سے دوچار ہو جائیں گے اور اس میں نیک و بد کی کوئی تمیز نہ ہو گی۔ بعد میں اِلّا کے اقتضا کے تحت ایک جزو کو خسران سے نکال کر فلاح و نجاح سے سرفراز کر دیا جائے گا۔ بلکہ عربی زبان میں "اِلّا" مجموعی حکم کی زد میں آنے والی صف سے مستثنیٰ افراد کو پہلے ہی الگ نکال دیتا ہے" اور اس کی تائید میں موصوف نے کئی آیات پیش کی ہیں۔

اپنے موقف کی تائید میں مَیں بھی ایک اقتباس پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ سورۂ مدثر میں فرمایا گیا ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ۔ إِلَّا أَصْحَابَ الْيَمِينِ ۔ فِي جَنَّاتٍ ...... الخ (ہر نفس اپنے کسب کے بدلے رہن ہے، سوائے دائیں ہاتھ والوں کے، جو جنتوں میں ہوں گے) اگر نعیم صاحب کا اصول اس اقتباس پر بھی لاگو کیا جائے تو مطلب یہ ہو گا کہ دائیں ہاتھ والے اپنے کسبِ اعمال سے پہلے ہی جنتوں میں پہنچا دیے جائیں گے اور ظاہر ہے کہ بات قطعاً غلط ہے۔ دنیا میں اپنے اعمال درست رکھنے والے ہی اپنے اعمالِ صالحہ کی بدولت (نیز عقائد صحیحہ کے ساتھ ساتھ) جنت پانے کے حقدار ٹھہرائے جائیں گے۔ اسی لیے دنیا کا یہ دارالامتحان تیار کیا گیا ہے، اور انسان کو اس میں مہلتِ عمل دی گئی ہے۔ گویا فی الواقع ہر نفس اپنے کسب کے بدلے رہن ہے۔ البتہ ان میں سے جو نیک اعمال کی بدولت اپنا نفس رہن سے چھڑا لیں گے وہی اصحٰب الیمین ٹھہریں گے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ "اِلّا" کا استثنا ہمیشہ اسی طرح نہیں ہوتا جس طرح محترم نعیم صاحب کی پیش کردہ مثالوں میں آیا ہے۔ اسی لیے عربی قواعد میں بھی استثنا کی دو حالتیں بیان کی گئی ہیں۔ متصل اور منقطع۔ اوّل الذکر کی مثال وہ ہے جو مَیں نے پیش کی، اور جس کی مثال میرے نزدیک "العصر" کا استثنا بھی ہے، اور ثانی الذکر میں نعیم صاحب کی پیش کردہ مثالیں آ جاتی ہیں۔

نعیم صاحب نے اس کے علاوہ جتنی بھی آیات سے اپنے موقف کو مزید تقویت دی ہے انہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہوں۔ بات تو صرف غیر مسلم کو سمجھانے کی تھی۔ اور وہ العصر کی اس گواہی سے تو ہرگز انکار نہیں کر سکتا کہ انسان مسلسل خسارے میں زندگی گزارتا ہے، البتہ اہلِ ایمان کو مستثنیٰ کرنے کی گواہی بھی زمانہ ہی دے رہا ہے؟ — یہ بات اگر صحیح ہوتی تو جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، کوئی کافر بھی ایمان لانے سے باز نہ رہتا۔ اور پھر اب تو وہ بات ہی ختم ہو گئی ہے، کیونکہ میں نے "موت" کے بجائے خود "گزرتے ہوئے زمانے" کو انسان کا خسارہ تسلیم کر لیا ہے، لہٰذا اس موضوع پر مزید قلم فرسائی کی حاجت نہیں رہی۔

محترم پروفیسر آسی ضیائی صاحب نے مستفسرانہ انداز میں جو بحث چھیڑی تھی، اس کے سلسلے میں دو تین تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔ اب ان کی آخری تحریر کے ساتھ اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے۔ (ادارہ)

حدود اللہ (بلحاظ موضوعات)

ایک ایسی کتاب جس میں قرآن کریم کے مضامین کو ان کے عنوانات کے تحت (اردو میں) یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ قاری کو جو بھی مسئلہ دریافت طلب ہو بہ آسانی چند لمحوں میں معلوم کر سکے۔

مجلد، صفحات: ۳۲۰ - ہدیہ ۲۸/- روپے - کتب فروش بھی رجوع فرمائیں

عالمگیر پبلشرز - تاج مینشن - B/3 کمرشیل ایریا - ناظم آباد ۲ کراچی

© rasailojaraid.com